بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

انگلستان کے مشہور افسانہ نگار سٹیونسن (STEVENSON) نے یوں تو بیشمار کہانیاں ایسی لکھی ہیں جن میں ضمیر کی کشمکش کو نہایت ہی عمدہ طریقے سے واضح کیا گیا ہے مگر اُس کی جس کہانی کو شہرتِ دوام حاصل ہوئی ہے وہ مارکھیم (MARKHEIM) ہے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار مارکھیم ایک شریفانہ زندگی بسر کرنے کا خواہاں ہے لیکن اُسے اتنی دولت ہاتھ نہیں آتی جس سے وہ اپنے اس ارادہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکے۔ چنانچہ وہ اپنے اس نیک مقصد کے حصول کیلیے ایک دکاندار کو قتل کر دیتا ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس دولت کو حاصل کر لینے کے بعد وہ ایک اچھی زندگی گزارنے کے قابل ہو جائے گا۔ اُس کے دل میں اس دکاندار کے خلاف کسی قسم کا کوئی بغض و عناد نہیں وہ محض ایک اچھے مقصد کے لیے اس بری حرکت کا ارتکاب کرتا ہے اور اپنے اس فعل پر نادم بھی ہے مگر اسے ناگزیر بھی خیال کرتا ہے۔ اسی اثنا میں جب وہ قتل کر چکا ہے اُس کا اپنا ضمیر ایک انسانی پیکر میں اُس کے سامنے حاضر ہوتا ہے اور اسے اس بات پر اُکساتا ہے کہ تم اس دکاندار کی ملازمہ کو بھی قتل کر دو تاکہ تمہارا یہ راز افشا نہ ہونے پائے۔ اس پر مارکھیم یہ کہتا ہے کہ میں نے دکاندار کو تو ایک ضرورت کے تحت قتل کیا تھا لیکن میں اب ملازمہ پر ہاتھ کیوں اٹھاؤں۔ اس کا ضمیر پھر اُس کی توجہ اس امر کی طرف دلاتا ہے کہ تمہیں محفوظ و مامون زندگی بسر کرنے کے لیے اس کام کو بھی کرنا ہی ہوگا مارکھیم اس میں تامل کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میرا یہ قتل کا فعل بُرا ہی سہی مگر مجھ میں نیکی اور شرافت کے سارے احساسات ختم تو نہیں ہوئے۔ میں اس بیگناہ پر ہاتھ اٹھانے کے لیے تیار نہیں

اُس کا ضمیر اُسے اشاروں میں سمجھاتا ہے کہ جس طرح تم نے بے گناہ دکاندار کو ایک اچھے مقصد کی خاطر موت کے گھاٹ اتار دیا ہے اسی طرح یہ کام بھی کر ڈالو اور پھر اطمینان سے زندگی بسر کرو مگر مارکھیم آمادہ نہیں ہوتا۔ وہ پھر اسے اس کا ماضی یاد دلاتا ہے کہ تم وہ وقت یاد کرو جب تمہیں جھوٹ سے نفرت تھی، اور پھر تم نے اسے بولنا شروع کیا، اس کے بعد تم نے چوری شروع کی اور اب قتل جیسے ظالمانہ فعل کا ارتکاب کیا ہے حالانکہ چند سال پہلے قاتلوں کی محض تصاویر دیکھنے سے تمہارے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جایا کرتے تھے۔ یہ ہے تمہارے انحطاط کا راستہ۔

اس کہانی کے فنی پہلوؤں سے قطع نظر اس میں جس بڑی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ نیک مقاصد کا حصول اُسی صورت ممکن ہے جب ذرائع نیک ہوں۔ اگر آپ کسی اچھے نصب العین کے لیے جد و جہد کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ آپ اس کے لیے اچھے ذرائع بھی اختیار کریں۔ اصلاحِ حال کے لیے جو مختلف طریقے کام میں لائے جاتے ہیں وہ بذاتِ خود اصلاح کا نہایت ہی ضروری جزو ہوتے ہیں اور انہیں نظر انداز کرکے اگر مخلصانہ کوشش بھی کی جاتے تو اصلاحِ حال کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوتا۔

اہلِ یورپ برسہا برس سے مساوات، آزادی اور اخوت کی تعلیم دیتے چلے آ رہے ہیں۔ انہوں نے اس مقصد کے حاصل کرنے کے لیے سرتوڑ کوششیں بھی کی ہیں لیکن اس خواب کی عملی تعبیر جب ہمارے سامنے آتی ہے تو وہ سخت گھناؤنی دکھائی دیتی ہے

اس دلکش نعرہ سے عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ اہلِ یورپ امن و امان کی ایک ایسی دنیا آباد کرنا چاہتے ہیں جس میں تمام انسان انسانیت کی بنا پر ایک جیسے سلوک کے مستحق ہوں وہ ایک دوسرے کے ساتھ رشتۂ اخوت میں بندھے ہوتے ہوں، آزادی اُن کا پیدائشی

حق ہو اور اس عزو شرف کو دنیا کی کوئی قوت سلب نہ کر سکے۔ یہ نعرہ کتنا صحیح اور فطرت انسانی کے قریب ہے لیکن سوچیے آخر اس نعرہ کے علمبرداروں کو اس نیک مقصد کے حصول میں ناکامی کیوں ہوئی۔ وہ لوگ جو دنیا کو انسانی مساوات کا درس دینے کے لیے اٹھے تھے انہوں نے گورے اور کالے کی تمیز روا رکھی، وہ جنہوں نے انسانی اخوت کا پرچار کیا تھا انہوں نے اپنی قوم کے ماسوا دوسری اقوام سے اتنا ظالمانہ سلوک کیا کہ اگر اسے درندوں کی طرف بھی منسوب کیا جاتے تو وہ شرم کے مارے اپنی گردنیں جھکا دیں، وہ جنہوں نے آزادی کی دہائی دی تھی۔ انہوں نے مشرقی قوموں کو تاخت و تاراج کیا، نہ صرف اُن کی دولت لوٹی بلکہ اُن کی متاعِ ایمان پر بھی مسلسل یورش کی تاکہ ان کے اندر آزادی حاصل کرنے کی ساری امنگیں ختم ہو جائیں۔

ممکن ہے کہ اس اندوہناک صورتِ حال کو دیکھ کر کوئی شخص یہ کہے کہ اہلِ مغرب اپنے ان دعاوی میں مخلص نہ تھے۔ یہ بات کسی حد تک درست ہے لیکن عقل یہ باور کرنے پر آمادہ نہیں ہوتی کہ ایک عظیم تر اِعظم کی ساری اقوام اس منافقت اور دورنگی کو اپنا قومی شعار بنانے کے لیے تیار ہو جائیں۔ یہ بات تو کسی حد تک تسلیم ہے کہ ان مختلف اقوام کے عیار اور چالاک لوگ مکر و فریب سے ان قوموں کے اندر قوت و طاقت حاصل کر لیں اور پھر وسائلِ حکومت کو کام میں لا کر افراد کو غلط راہوں پر ڈال دیں لیکن طبیعت اس بات کو قبول نہیں کر سکتی کہ اس خوفناک انحطاط کا یہ وسیع کام قوم کی معتدبہ اکثریت کی مرضی کے بغیر کیا جا سکتا ہے۔

ہمارے نزدیک اہلِ یورپ کی اس مقدس مشن میں ناکامی کی سب سے بڑی وجہ وہی ہے جسے سٹیونسن نے مارکھیم کی مختصر کہانی میں بیان کیا ہے یعنی اگر مقاصد نیک بھی ہوں لیکن جب تک اُن کے حصول کے لیے نیک ذرائع اختیار نہ کیے جائیں انسان کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

آپ اب اسی نعرہ کو لیجیے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے یعنی مساوات، اخوت و آزادی۔ اگر یہ تینوں انسان کے پیدائشی حقوق ہیں جن سے وہ فطری طور پر نوازا گیا ہے تو پھر اس میں عرب و عجم، مغرب و مشرق یا گورے اور کالے کی قطعاً کوئی تمیز نہیں ہو سکتی۔ ہر انسان کو انسانیت کے ایک فرد کی حیثیت سے پیدائش کے وقت یہ حقوق خود بخود حاصل ہو جاتے ہیں۔ وطن، رنگ و نسل، یا زبان کے کسی امتیاز کی بنا پر کسی انسان کو ان سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔

اس نقطۂ نظر کے مطابق انسانیت کی حد تک یہ حقوق ہمہ گیر اور آفاقی ہیں۔ اب جو فرد، گروہ یا قوم دنیا میں اس دعوے کے ساتھ اٹھے کہ جن انسانوں کے یہ حقوق سلب کیے گئے ہیں انہیں اُسے واپس دلوانا ہے اور اس کام کو ہی وہ زندگی کا سب سے بڑا مقصد خیال کرے اُسے سب سے پہلے اپنے دل سے "من و تو" کی تمیز مٹانا ہوگی اور اپنے آپ کو وقتی فائدوں اور مصلحتوں سے بلند کر کے اس عظیم خدمت کے لیے تیار کرنا ہوگا۔ پھر اس کے لیے وہ اسی نوعیت کی عملی تدابیر اختیار کرے گی جن میں گروہی اور وطنی عصبیت اور نسلی تفوق کا کوئی شائبہ تک نہ ہو۔ اس آفاقی نقطۂ نظر اور خالص اخلاقی اور انسانی طرزِ عمل ہی سے انسانیت کو آزادی، مساوات اور اخوت کے حقوق حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر ایک قوم دعویٰ تو ان انسانی حقوق کا کرے لیکن اُس کے فکر و عمل کے پیچھے تنگ نظری، تعصب اور خود غرضی کارفرما ہو تو پھر وہ اس مقدس مقصد میں نیک تمناؤں اور آرزوؤں کے باوجود کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔

پروفیسر وائٹ ہیڈ (WHITE HEAD) نے مذہب کی تعریف کرتے ہوئے ایک بڑے کام کی بات کہی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ آفاقی نقطۂ نظر اس بات کا متقاضی ہے کہ انسان مادی نفع و نقصان سے بلند ہو کر سوچے اور اُس کا اپنے مادی ماحول سے تعلق تو ہو مگر وہ اس کے خم و پیچ میں گرفتار نہ ہونے پائے۔ پروفیسر موصوف نے یہ بات اگرچہ مذہب

کے طعن میں کہی ہے لیکن اسی میں اُس نے مغربی فکر و عمل کے تضاد کی بھی نہایت اچھے طریق سے نشاندہی کر دی ہے۔ اہلِ مغرب دنیا کو تعلیم تو آزادی، مساوات اور اخوت کی دیتے ہیں، لیکن اس کے طبعی تقاضوں کو پورا کرنے پر تیار نہیں ہوتے۔ پوری نوعِ انسانی ان نعمتوں سے اسی وقت متمتع ہو سکتی ہے جب ان کی حفاظت و پاسبانی کرنے والے لوگ قومی اور نسلی تعصبات سے پاک ہوں اور وہ صرف انسانیت کی خدمت کو اپنا مقصدِ زندگی بنائیں۔ ظاہر بات ہے کہ یہ مقدس مشن اسی صورت میں کامیاب ہو سکتا ہے جب اس کے علمبرداروں کا اس کائنات اور اس کی ساری اشیاء کے بارے میں نقطۂ نظر تبدیل ہو جائے۔ اس مشن کو اپنا لینے کے بعد ان کا فرض ہے کہ وہ کامیابی کے معیار اور اشیاء و افعال کے متعلق مادی نقطۂ نظر ترک کر دیں اور انہیں وزن کرنے اور ان کی تقویم کے لیے ایسی میزان اور ایسا مقوم تیار کریں جن سے اس مقصد کو تقویت حاصل ہوتی ہو۔

مگر مغرب میں جو کچھ فی الواقع ہوا ہے وہ اس مقصد کی عین ضد ہے۔ اہلِ مغرب نے مارکھیم کی طرح آفاقی مقاصد کو نسلی اور قومی تعصبات کے ذریعہ حاصل کرنے کی ناکام کوشش کی وہ دنیا میں مساوات کے علمبردار بن کر اٹھے ہیں مگر مادی فوائد و لذائذ کی پرستش نے انہیں اتنا تنگ نظر بنا دیا ہے کہ وہ دنیا کے سارے منافع اپنی ذات کے لیے اور اپنی قوم کے لیے سمیٹ لینا چاہتے ہیں۔ اسی بنیاد پر انہوں نے خیر و شر کے سارے معیار مرتب کیے ہیں۔ چنانچہ مساوات کی عملی تعبیر اب اُن کے نزدیک یہ قرار پائی ہے کہ خود اُن کی اپنی قوم کے مختلف افراد میں تو مساوات ہو لیکن جو لوگ اُن کے وطن یا اُن کی نسل سے تعلق نہیں رکھتے انہیں غلام بنا کر رکھا جائے۔

اسی طرح آزادی کے معنی بھی اُن کے نزدیک یہی ہیں کہ ان کی اپنی قوم آزاد ہو اور باقی ساری اقوام کو ان کی خدمت اور چاکری کے لیے غلام بنا دیا جائے۔ یہ ایک ایسا فکری اور

وعملی تضاد ہے جس میں مغرب کا ہر انسان اپنے آپ کو گرفتار پاتا ہے۔

فکر و نظر کی اس تبدیلی کے محرکات پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس تبدیلی کا سب سے بڑا محرک انسان کی دنیا پرستی ہے۔ اہلِ مغرب پر سے جس دن سے مذہب کی گرفت ڈھیلی ہوئی ہے وہ اسی روز سے اس تضاد کا شکار چلے آرہے ہیں۔ آزادی، مساوات اور اخوت انسانی فطرت کی پکار ہیں۔ انسانی ضمیر جب بھی بیدار ہوتا ہے تو وہ اپنے ان پیدائشی حقوق کا مطالبہ کرتا ہے۔ انسان ان حقوق کا شعور حاصل کرنے کے بعد اس حقیقت کا بھی کھوج لگانے کے لیے بیتاب ہوتا ہے کہ وہ ان کا سرچشمہ معلوم کرے۔ وہ بارہا یہ سوال کرتا ہے کہ اگر میرے یہ حقوق مستقل اور پیدائشی ہیں تو پھر اُن کا سرچشمہ ریاست، حکومت یا انسان سے کوئی ماوراء ذات ہے اور اگر مجھے افراد یا انسانی اداروں نے ان سے نوازا ہے تو پھر میرا یہ کہنا کہ یہ پیدائشی ہیں، سراسر باطل ہے۔ ان حقوق کا مستقل اور انسانوں کے لیے پیدائشی ہونا اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ یہ خداوند تعالیٰ کے عطا کردہ ہیں۔ جب ہم یہ تسلیم کرلیں کہ ان کا سرچشمہ خدا کی ذات ہے تو پھر ان کے حصول اور حفاظت اور پاسبانی کے لیے بھی خدا کے پیش کردہ قوانین و ضوابط کی پابندی کرنی چاہیے۔ اہلِ مغرب نے ان خدائی حقوق کے حصول اور حفاظت کے لیے دنیاوی ضابطوں کی پابندی کرنا چاہی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے افکار و اعمال میں زبردست اختلال پیدا ہوگیا۔ ایک مغربی مفکر اینڈرو کانوے نے اس فکری انتشار کی بڑے عمدہ طریقے سے مندرجہ ذیل الفاظ میں وضاحت کی ہے:-

"انسانوں میں آزادی اور مساوات کا تصور اُسی وقت صحیح معنوں میں پنپ سکتا ہے جب انہیں خدا کی مخلوق کی حیثیت سے دیکھا جائے اور یہ تسلیم کیا جائے کہ خدا کی نظر میں وہ سب برابر ہیں۔ اگر خدا کے وجود اور اخلاقی قوانین کی عملداری

کا انکار کر دیا جائے تو پھر غلامی کے خلاف جہاد کی اور قہاری کے خلاف، اور ناجائز انتفاع کے خلاف کوئی دلیل بھی صحیح قرار نہیں دی جا سکتی۔ اگر انسان کسی مستقل عزو شرف کا مالک نہیں، اگر اسے ارادہ و اختیار کی کوئی مستقل آزادی حاصل نہیں، اگر اس کے مستقل حقوق اور فرائض نہیں — یہ سب چیزیں خارج سے کسی فرد یا گروہ نے اسے وقتی طور پر عطا کی ہیں تو اس صورت میں اگر وہ چالاک اور عیار لوگوں کے ہاتھوں میں غلام بن جاتا ہے اور وہ اس کی خدمت سے فائدہ اٹھاتے ہیں تو اس میں کوئی قباحت معلوم نہیں ہوتی۔ وہ حقوق جو انسان کو خدا نے دیئے ہیں وہ خود خدا ہی سلب کر سکتا ہے۔ لیکن وہ حقوق جو انسان کو انسان نے یا کسی انسانی ادارے نے دے رکھے ہیں وہ یہ انسان یا ادارے جب چاہیں واپس لینے کے پوری طرح مجاز ہیں۔ جب تک یہ تسلیم نہ کیا جائے کہ کوئی مستقل حقوق انسان کو خدا نے عطا کیے ہیں، اس وقت تک یہ کہنا بے معنی ہے کہ انسان بعض ایسے حقوق رکھتا ہے جنہیں کوئی انسانی ادارہ نظر انداز نہیں کر سکتا۔

کیا انسانی اخوت محض ایک رعایت ہے جو مادہ پرستانہ نظریات کی حامل ریاست (جس کا رہنما اصول وقتی مصلحت ہے) نے انسان کو دے رکھی ہے یا اسے انسانوں نے خدا کے عیال کی حیثیت سے حاصل کیا ہے۔ کس نظریہ میں زیادہ پائیداری اور استواری ہے؟ کیا آزادی کا تصور روح کی آزادی، ارادہ و اختیار کی آزادی سے پیدا ہوتا ہے یا اسے ایک مادہ پرستانہ معاشرہ ایک رعایت کے طور پر لوگوں کو دیتا ہے۔ ایک انسان جو ریاست کا بے بس غلام ہے اُس کے اعمال و افعال پر آزادی کا اطلاق کس طرح کیا

جا سکتا ہے۔

"انسانی عزّ و شرف کے پیدائشی حق کو تسلیم کیے بغیر اخلاق کے اندر ایک زبردست اختلال رونما ہوتا ہے۔ اگر اس بنیادی حقیقت کو نظر انداز کر کے آگے بڑھا جائے تو ایسی منزل جلد ہی آجاتی ہے جب قومی اور نسلی تفوق کا نظریہ بطور ایک ناگزیر نتیجہ کے ماننا پڑتا ہے"

پروفیسر موصوف نے اس مضمون میں بڑی دیدہ وری سے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ آپ جب یہ کہتے ہیں کہ مساوات، اخوت انسانی اور آزادی انسان کے فطری حقوق ہیں تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ ہم ان مستقل حقوق کا سرچشمہ کسی ایسی ذات کو سمجھیں جسے کبھی فنا نہیں اور جو اپنی بقا کے لیے کسی دوسری ہستی کی محتاج نہیں کیونکہ اگر یہ حقوق فانی انسانوں کے عطا کردہ ہیں تو پھر ان کا مستقل اور فطری ہونا محل نظر ہے۔ اور اگر انسان انہیں عطا کرنے کا مجاز ہے تو وہ انہیں سلب کرنے کا بھی پورا پورا حق اور اختیار رکھتا ہے۔ انسان کا یہ وسیع اختیار انکارِ خدا کا بالکل منطقی نتیجہ ہے۔

معاملہ پھر اسی پر ختم نہیں ہوتا بلکہ انسانوں کے اس غیر مسئول اقتدار کا اثر زندگی کے سارے شعبوں پر مرتب ہوتا ہے۔ جب انسان کو دنیا کے معاملات میں "مختارِ کل" مان لیا جائے تو پھر اُس سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ کسی اخلاقی ضابطہ کی پابندی کرے بالکل بے معنی سی چیز نظر آتی ہے ان حالات میں اُس کے فکر و عمل کا محرک ایک ہی ہوتا ہے کہ وہ اپنے لیے اور اپنی قوم کے لیے زیادہ سے زیادہ مادی منافع حاصل کرے۔ جس راہ پر چلنے کے بعد وہ اس مقصد کو جلد از جلد حاصل کر سکتا ہے وہی اُس کے نزدیک نیکی اور اخلاق ہے اور جس سے اس مقصد کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو وہ اُس کی نظر میں برائی اور عیب ہے۔ وہ پھر اخلاق کی مستقل اقدار پر ایمان

نہیں رکھتا بلکہ اُس کے خیر و شر کے پیمانے مادی "فلاح و بہبود" کے ساتھ ہر آن بدلتے رہتے ہیں۔ وہ مارکھیم کی طرح اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ دنیا میں اصل نیکی صرف مقصد کا حصول ہے اور اس کے لیے جو ذرائع بھی اختیار کیے جائیں وہ سارے درست اور مبنی بر انصاف ہیں۔ اگر دولت چوری کرنے سے حاصل ہوتی ہو تو اس کا ارتکاب کر لیا جائے اور اگر قتل کرنے اور ڈاکہ ڈالنے سے اس کا حصول ممکن ہو تو پھر ان ظالمانہ افعال کے کرنے میں بھی کوئی تامل نہ کیا جائے۔ اسی مضمون کو پروفیسر صاحب نے ایک دوسرے مقام پر بڑی صراحت سے مندرجۂ ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"یہ اصول کہ ریاست کی فلاح انتہائی نیکی ہے اور اس کے لیے جو ذرائع بھی اختیار کیے جائیں وہ صحیح اور درست ہیں۔ یہ وہ الجھن ہے جس میں اہلِ جرمنی گرفتار ہیں۔ آخر اُن لوگوں کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ اُن حضرات کو گردن زدنی سمجھیں جنہوں نے نازی قانون کے احترام میں لوگوں پر دستِ ظلم دراز کیا۔ اگر انہیں سزا کا مستحق سمجھا جا سکتا ہے تو صرف اُسی صورت میں جب یہ مان لیا جائے کہ خدا نے انسانی اعمال کے متعلق کچھ اخلاقی ضابطے بھی مقرر فرمائے ہیں۔ اگر انسان کا اپنا بنایا ہوا قانون اُس کے حقوق کی اصل بنیاد ہے تو پھر ہمیں یہ زیب نہیں دیتا کہ ہم نازیوں کے یہودیوں پر ظلم و ستم کو نفرت کی نگاہ سے دیکھیں۔ اشتراکی حکومتوں میں کوئی انسان کسی مستقل حق کا مالک نہیں۔ اگر انسانوں کے فی الواقع دنیا میں کوئی مستقل حقوق موجود ہیں تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر انہیں کس ذات نے استقلال بخشا۔ اگر انسان اس کائنات کا خالق نہیں تو اسے یہ حق بھی حاصل نہیں کہ وہ انسانوں کو مستقل طور پر عزت و شرف کے لازوال خزانے عطا کرے اور انہیں دائمی حقوق سے نوازے

پروفیسر صاحب نے جو زوردار الفاظ نازیوں اور اشتراکیوں کے متعلق استعمال کیے ہیں وہ اگرچہ خود اپنی الجھنوں کے متعلق نہیں کیے لیکن انہوں نے امریکی قوم کے انحطاط کی طرف نہایت واضح الفاظ میں اشارہ کیا ہے اور نہایت کھلے طور پر اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ ہماری زندگی کا یہ تضاد کہ ایک طرف ہم انسانوں کے کچھ مستقل حقوق بھی تسلیم کرتے ہیں مگر دوسری طرف ان حقوق کے عطا کرنے والی ذات کے ضابطوں کی پابندی کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے — اس نے ہمیں بربادی کی راہ پر ڈال دیا ہے:

"امریکی زندگی کا مطالعہ اس امر کی واضح نشاندہی کرتا ہے کہ اس ملک میں جمہوریت روبہ انحطاط ہے۔ امریکی زندگی الحاد کے زیر اثر آ رہی ہے اور اس کی روحانی اور مذہبی بنیادیں آہستہ آہستہ منہدم ہوتی جا رہی ہیں۔ دنیائے مغرب ایک عجیب و غریب تضاد کا شکار ہے۔ وہ انسانوں کے مستقل اور پائیدار حقوق کو ان کے روحانی سرچشموں سے بھی منقطع کر رہی ہے اور پھر اس کے ساتھ اُن کی حفاظت اور پائیداری کا بھی التزام کرنا چاہتی ہے۔

یہ تضاد جس کی طرف پروفیسر صاحب نے اشارہ کیا ہے اس میں صرف دنیائے مغرب ہی گرفتار نہیں بلکہ دنیائے مشرق بھی اسی مرض میں مبتلا ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ دنیائے اسلام میں اس تضاد نے ایک افسوسناک انتشار کی صورت اختیار کر رکھی ہے تو یہ زیادہ صحیح ہوگا۔ اسی انتشار نے مسلم قوم کو انحطاط کی آخری حد تک پہنچا دیا ہے اور اسی وجہ سے ہماری ترقی اور خوشحالی کی ساری تدابیر ناکام و نامراد رہتی ہیں۔

ہم دنیا کو اپنے دعووں سے یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ مسلم قوم ایسے مقدس مقاصد کی علمبردار ہے جنہیں مادی فلاح و بہبود کے پیمانوں سے ناپا نہیں جا سکتا۔ وہ اپنے

نصب العین کے لحاظ سے روحانی اقدار اور اخلاقی ضابطوں کی پابند ہے، اسے رنگ و نسل، زبان اور وطن کے امتیازات سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ دعاوی اپنی جگہ بالکل صحیح اور درست ہیں لیکن انہیں محض زور دار الفاظ میں پیش کر دینے سے تو مقصد حل نہیں ہوتا۔ ہمارے یہ دعاوی ہم سے بعض مطالبات کرتے ہیں جن میں سب سے اہم مطالبہ یہ ہے کہ ہم جس اسلام کا ہر وقت ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں اس پر ہمیں خود بھی اعتماد ہو، نہ صرف اعتماد ہو بلکہ اسی کی محبت ہمارے دلوں میں جاگزیں ہو۔ اسلام کو ہم ایک سیاسی سٹنٹ کے طور پر استعمال نہ کریں بلکہ اس کے ساتھ ہم صحیح معنوں میں عقیدت رکھیں، اس کے اصول اور ضابطوں کی پابندی میں اپنی اور پوری نوع بشری کی فلاح سمجھیں اور ہر لحہ اس بات کے آرزو مند رہیں کہ ہم اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اس کے پیش کردہ سانچوں کے مطابق ڈھال لیں۔ اسلام پر ایمان لانے کے یہ بالکل بنیادی اور اساسی تقاضے ہیں۔ اور ان تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ہم جتنی مخلصانہ کوشش کریں گے وہی ہماری اسلام سے محبت اور عقیدت کا صحیح پیمانہ ہو گا۔

اس نقطۂ نظر سے جب ہم اپنا اور پوری مسلم قوم کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں اس امر کا شدید احساس ہوتا ہے کہ ہم اسلام سے اپنی محبت کے معاملے میں مخلص نہیں ہیں۔ اسلام سے ہمیں وابستگی تو ضرور ہے لیکن یہ وابستگی اتنی ہی ہے جتنی کہ خود اسلام میں تغیر پذیری کی صلاحیت۔ یہ زبان کی حد تک ہماری عقیدت کا مرکز و محور ہے لیکن عملی طور پر یہ ہمارا خادم ہے، جسے ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اتنا ہی دخل حاصل ہے جس کی ہم نے اسے اجازت دے رکھی ہے۔ اسے زندگی کا مقصود و مطلوب بنانے کی بجائے اب ہم نے ایک آلۂ کار بنا لیا ہے۔ یہ اب ہمارے ہاتھوں میں بے بس غلام ہے۔ ہمارا اصل مقصد اب معاشی فلاح و بہبود ہے اور اگر اس مقصد کے حصول میں اس سے کوئی خدمت لی جا سکتی ہو تو بہتر ورنہ اسے بڑی آسانی کے ساتھ نظر انداز کر کے بلکہ راہ کا سنگ گراں سمجھتے ہوئے راستے سے ہٹایا

(باقی صفحہ ۵۹ پر)

(بقیہ اشارات)

جا سکتا ہے۔ اس کی حیثیت اب مارکھیم کے اُس دکاندار کی سی رہ گئی ہے جو محض دولت کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اگر یہ خود ایک اطاعت شعار انسان کی طرح آگے بڑھ کر ہماری خواہشات کی تکمیل کر دے تو اس کی زندگی محفوظ ہے ورنہ مادی فلاح کا حصول اتنا بلند مقصد ہے کہ اسے اس مقصد کی قربانگاہ پر بے دریغ بھینٹ چڑھایا جا سکتا ہے۔ مسلمان اب اس کی پیروی اور اطاعت کے لیے زندہ نہیں بلکہ یہ اب ایک ناچیز بندہ کی حیثیت سے اپنے آقا کی چاکری کے لیے دنیا میں موجود ہے۔ آقا جتنی چاہے اس سے خدمت لے اور جب چاہے بغیر وجہ بیان کیے اسے اپنے ایوان سے نکال دے۔ پھر اسے یہ بھی اختیار حاصل نہیں کہ وہ آقا سے یہ پوچھے کہ حضور آپ نے مجھے کیوں نکال باہر پھینکا ہے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ اس ظلم پر بھی خاموش رہے اور جتنی خدمت اُس سے لی گئی ہے اُسے ہی اپنی سب سے بڑی سعادت سمجھتے ہوئے اپنا وقت بڑے سکون کے ساتھ گزار دے۔

آپ خود ہی سوچیے کہ دنیا کا کوئی دین اس بیچارگی اور درماندگی کی سطح پر رہتے ہوئے انسانیت کی کوئی خدمت سرانجام دے سکتا ہے۔ جب تک ہم کسی نظام حیات کو اپنا آئیڈیل نہیں بناتے، اس کی محبت میں گرفتار نہیں ہوتے، اُس کے مطالبات کے مطابق اپنی زندگی کے ڈھانچوں پر بدلنے پر اپنے آپ کو آمادہ نہیں کرتے اس وقت تک وہ دنیا کی مجلسوں میں گرمیٔ گفتار کا ذریعہ تو بن سکتا ہے مگر عملی زندگی میں بالکل بیکار ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے جو لوگوں کے افکار و نظریات اور جذبات و احساسات کو ایک خاص سانچے میں ڈھالنے کا عظیم پروگرام رکھتا ہے اُس نے سب سے پہلے اپنے ماننے والوں سے یکسوئی کا مطالبہ کیا ہے اور بڑے واشگاف الفاظ میں فرمایا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ (۲:۲۰۸)

اُے ایمان لانے والو! تم پورے کے پورے اسلام میں آجاؤ اور شیطان کی پیروی نہ کرو۔

قرآن پاک ہر اُس قدم کو جو اسلام سے ہٹ کر اٹھایا جائے شیطان کی پیروی سے تعبیر کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ اگر کسی کو رحمٰن کی اطاعت مطلوب ہے تو پھر اُسے صرف اسلام کا قلادہ ہی اپنی گردن میں پہننا چاہیے۔ جو شخص اسلام کے علاوہ بھی چند افکار و نظریات پر ایمان رکھتا ہے اور انہیں نوعِ بشری کی فلاح و بہبود کے لیے ضروری سمجھتا ہے وہ اپنے ایمان کے دعوے میں جھوٹا ہے۔

قرآن حکیم ایک دوسرے مقام پر اس انتخاب و اختیار (PICK AND CHOOSE) کی پالیسی کی نہ صرف مذمت کرتا ہے بلکہ اس کے خطرناک نتائج سے بھی پوری طرح روشناس کراتا ہے۔

أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلُ ذَٰلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَىٰ أَشَدِّ الْعَذَابِ۔ (البقرہ)

کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے کا انکار کرتے ہو۔ پھر تم میں سے جو لوگ ایسا کریں، اُن کی سزا اس کے سوا اور کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں ذلیل و خوار ہو کر رہیں اور آخرت میں شدید ترین عذاب کی طرف پھیر دیے جائیں گے

اس آیت میں خداوند تعالیٰ نے صاف طور پر فرمایا ہے کہ احکام دین کے اندر یہ تفریق کی پالیسی یعنی بعض حصوں کو مصلحتِ وقت یا خواہشِ نفس، یا مفادات کے مطابق پاکر انہیں قبول کرلینا اور اُن حصوں کو ترک کرنا جو بظاہر وقتی مصلحتوں یا نفس کے مطالبات یا قومی مفادات کے خلاف نظر آتے ہیں، دین کی پیروی نہیں بلکہ اُس کا مذاق ہے۔ جس دین کے متعلق ہمارے احساسات یہ ہوں کہ ہم اس کے اندر حسبِ منشا ترمیم و تنسیخ کرسکتے ہیں اور وہ صرف ہمارے مفادات کی تائید کرنے کے لیے دنیا میں نازل ہوا ہے، اُس کے متعلق ہمارے دلوں میں جذبۂ عقیدت کس طرح پیدا ہوسکتا ہے۔ وہ پھر ہماری محبت کا مرکز نہیں رہتا بلکہ ہمارے نفس کے مطالبات، ہمارے قومی اور وطنی تقاضے ہمارے اصل معبود قرار پاتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ کہنا کہ انسان مذہب کے لیے پیدا نہیں کیا گیا بلکہ مذہب انسان کے لیے پیدا کیا گیا ہے، مذہب کے ساتھ ایک صریح ظلم اور زیادتی ہے اور اسلامی تعلیمات سے ناواقفیت کی ایک بڑی افسوسناک بلکہ عبرتناک مثال ہے۔

دنیا کا کونسا ایسا انسان ہے اور اس کرۂ ارضی کی کونسی ایسی قوم ہے جس کے فکر و عمل میں اسلامی تعلیمات کے کچھ اجزا شامل نہیں؟ خالص کفر تو ایک لمحہ کے لیے بھی اس دنیا میں قائم نہیں رہ سکتا۔ کفر بھی اپنے قیام اور بقا کے لیے بعض ایسے اصولوں کا محتاج ہے جن کی نشاندہی اسلام نے بھی کی ہے۔ مثلاً صبر و ثبات، اور نظم و ضبط۔ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت عرب کے مسلم قبائل اور غیر مسلم قبائل میں بعض ایسی صفات موجود تھیں جن کی قرآن مجید نے توصیف کی ہے مثلاً مہمان نوازی، لیکن یہ قدرِ مشترک ان کے درمیان اسلام و کفر کے امتیازات مٹانے کا ذریعہ نہ بن سکی۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ عرب کے غیر مسلم قبائل میں اگرچہ بعض ایسی خصوصیات پائی جاتی تھیں جو خداوند تعالیٰ کو عزیز ہیں لیکن انہوں نے اسلام کو بطور مبدأ اور اساسِ حیات تسلیم نہیں کیا تھا اس لیے وہ ان خصوصیات کے حامل ہونے کے باوجود کافر ہی رہے۔ حضرت ابوبکر صدیق

رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کو مرتد قرار دیکر اُن کے خلاف تلوار اٹھائی جو سوائے زکوٰۃ ادا کرنے کے اسلام کے باقی احکام نہ صرف مانتے تھے بلکہ ان پر عمل بھی کرتے تھے لیکن ان کے اس ادھورے اسلام کو قبول نہ کیا گیا اور ان کے خلاف خلیفۂ اول ؓ اس انداز سے صف آرا ہوئے جیسے کہ کفار کے خلاف اعلانِ جنگ کیا جاتا ہے۔ یہ سب حقائق اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ اسلام میں کسی شخص، قوم یا پوری دنیا کو بھی ترمیم و تنسیخ کا اختیار حاصل نہیں۔

تنسیخ و ترمیم کا یہ عمل اس بات کی واضح علامت ہے کہ ہم اس دین کو ناقص سمجھتے ہیں اور جس نظامِ زندگی کے بارے میں خود اس کے علمبرداروں کی یہ رائے ہو وہ دوسروں کے لیے کس طرح باعثِ کشش ہو سکتا ہے۔ اسلام کے اندر کتر بیونت کرنے والے لوگوں کو قرآن مجید نے بڑی صراحت سے اُن کا انجام بھی بتا دیا ہے یعنی انہیں اس دنیا میں بھی ناکامی اور رسوائی اور آخرت میں وہ دردناک عذاب میں مبتلا کیے جائیں گے۔ جو فرد اسلام کے اندر انتخاب و اختیار کی پالیسی کا قائل ہے وہ درحقیقت خدا کا بندہ نہیں بلکہ اپنی خواہشات کا غلام ہے اور ایسے لوگ یا گروہ دنیا میں کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ کامیابی اصولوں کی پیروی کرنے سے حاصل ہوتی ہے، اصولوں کو نفس کے مطالبہ کے تحت توڑنے اور موڑنے سے حاصل نہیں ہوتی۔ جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ وہ کسی نظام کا پابند نہیں اور دنیا کے ہر نظام میں اُس کی خواہش کے مطابق تبدیلی کی جا سکتی ہے وہ دراصل قوموں کے عروج و زوال کے بنیادی فلسفہ تک سے ناواقف ہے۔ مسلمانوں کا تو ذکر ہی چھوڑیئے کیونکہ ایک شخص کا مسلمان ہونا ہی اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ وہ اسلام کو بطور ہدایتِ الٰہی تسلیم کرتا ہے اس لیے وہ اس میں کسی تبدیلی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اس اختیار و انتخاب کے نظریہ کو اُن لوگوں نے بھی باطل ٹھہرایا ہے جو کسی الہامی تعلیم کے قائل نہیں۔ انہوں نے دلائل کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ دنیا کا ہر نظام ایک کل ہوتا ہے اور اس کے چند اجزا مستعار لے لینے سے اس نظام کے اچھے پہلوؤں کو اپنایا نہیں جا سکتا۔ ابھی حال ہی میں ایک مغربی فاضل نے اپنے ایک مضمون میں اس امر کی

صراحت کرتے ہوئے کہا:

"تہذیب ایک کل ہے، اس کے فنونِ لطیفہ، اس کے الٰہیات، اس کے معاشرتی اصول اس کے معاشی اور صنعتی کمالات میں ایک گہرا رابطہ ہے۔ مجھے اس امر میں شک ہے کہ کیا کوئی قوم اپنی مرضی کے مطابق کسی نظام میں انتخاب و اختیار کی پالیسی اختیار کر سکتی ہے۔" (لوئی ڈکسن)

تفہیم القرآن جلد سوم کے متعلق ضروری اعلان

ملک کے ہر حصہ سے تفہیم القرآن جلد سوم کے متعلق پیہم استفسار کیا جا رہا ہے کہ اس کی اشاعت کب ہو گی؟ اُن حضرات کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ مولانا نے محترم نے اس کا مسودہ ہمیں دے دیا ہے اور اس کی کتابت ہو رہی ہے۔

ناظرین کو اس کے انتظار کی زحمت اس لیے اٹھانا پڑی کہ مولانا نے اس کی تیاری کے سلسلے میں پچھلے سال ارض القرآن کا ایک اہم سفر کیا اور اُن تمام علاقوں کا سروے کرتے ہوئے ضروری تاریخی مقامات کے فوٹو اور جغرافیائی نقشے حاصل کیے جن کا اس تفسیر سے تعلق ہے۔ جلد سوم میں یہ نقشے اور فوٹو شامل کیے جا رہے ہیں۔ جلد سوم تاریخ قرآن کی ایک اہم مصور دستاویز ہو گی۔ انشاء اللہ

ناظرین خاص اور خاص میں مولانا محترم کے لیے دعا فرمایا کریں کہ اللہ تعالیٰ اس عظیم کام میں ان کی مدد فرمائے اور ہمیں توفیق دے کہ ہم اس کی شایانِ شان اشاعت کر کے اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکیں آمین۔ اس سلسلہ میں ہمیں اپنے کرم فرما اور خیر خواہ حضرات کے مفید مشوروں کی بھی ضرورت ہے۔

شیخ قمر الدین ناشر تفہیم القرآن

مکتبہ تعمیر انسانیت - موچی دروازہ - لاہور